بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

مایوسی کا مرض ' ایک خطرناک مرض ہے 'کسی فرد کو لاحق ہو یا کسی قوم کو۔ لیکن مومن کے لیے مایوسی کینسر کا حکم رکھتی ہے۔ خصوصاً اس کے لیے جس نے دعوت ' اصلاحِ خلق اور انقلابِ اجتماعی کا بیڑا اٹھایا ہو۔ اور کون مسلمان ہے جو اپنی بساط بھر اس ذمہ داری کو اٹھائے بغیر اپنے ایمان کے دعوے میں سچا ہو سکتا ہے: "ایمان والے تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ؐ پر ایمان لائے ' پھر وہ کسی شک اور تذبذب میں نہ پڑے ' اور انھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا۔ یہ لوگ جو ہیں ' وہی (اپنے ایمان میں) سچے ہیں" (الحجرات ۴۹:۱۵)۔

دعوت و اِصلاح اور اِجتماعی اِنقلاب کا کام تمام نیک کاموں میں سب سے چوٹی کا کام ' اور سب سے بڑھ کر پھلنے پھولنے والا ' بے حد و حساب اجرِ عظیم کا حامل کام ہے۔ کسی ایک خیر کی راہ دکھانے پر ہی اتنے اجر کی بشارت ہے جتنا اسے کرنے والے کے لیے ہے (مسلم)، اور اسی طرح صرف ایک آدمی کو صحیح راستے سے لگا دینے کو "سرخ اونٹنیوں کے ایک ریوڑ" سے کہیں زیادہ نفع بخش دولت قرار دیا گیا ہے (بخاری، مسلم)۔ پھر ان کوششوں اور جدوجہد کا درجہ متعین کرنا کس کے بس میں ہے جو اصلاحِ معاشرہ اور نظامِ حق کے قیام جیسے مقاصد کے لیے ہوں ' جن کے نتیجے میں خیر کی بہار آئے اور اس کے پھلوں سے ان گنت لوگ فائدہ اٹھائیں۔ سید احمد شہید کے الفاظ میں: قوانینِ شرعیہ کی پابندی کی وجہ سے دنیوی اور اُخروی معاملات درست اور باقاعدہ ہو جاتے ہیں۔ معاملات میں نیت کی درستی ' اور دلوں میں اطاعت کی طرف عام رغبت پیدا ہوتی ہے ' اور نیکوکاری اور خدا ترسی کا شوق ترقی کر جاتا ہے۔ حکمرانوں کے انصاف اور اہلِ سخاوت کی فیاضی کی وجہ سے فارغ البالی اور خوش حالی عام ہوتی ہے ' فصلیں اچھی ہوتی ہیں ' تجارت کا فروغ ہوتا ہے اور مالوں میں ترقی اور نمو ہوتا ہے۔

فرمایا ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: ایک رات دن جہاد میں گزارنا ' ایک ماہ کے روزوں اور

قیام سے افضل ہے (مسلم)۔ ہر مرنے والے کے اعمال نامے پر مُہر لگا دی جاتی ہے 'مگر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے (ابو داود، ترمذی)۔ جس نے کسی نیکی کو قائم کر دیا' اس کے لیے اس کا اجر ہے جب تک اس پر عمل کیا جائے' زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی (طبرانی)۔

اس لیے شیطان سب سے زیادہ چالاکی اور تن دہی کے ساتھ جس کام کو خراب کرنے کے لیے گھات لگاتا ہے اور جال بچھاتا ہے' وہ قوم اور معاشرے کی اصلاحِ اجتماعی کا کام ہے۔ اس کے پھندے اور فریب بے شمار ہیں 'لیکن سب سے خطرناک اور کارگر جال جو وہ پھیلاتا ہے' وہ مایوسی اور ناامیدی کا جال ہے۔ وہ خود ابلیس ہے 'یعنی انتہائی مایوسی کا مارا ہوا' اس لیے خوب جانتا ہے کہ جو ایک دفعہ اس جال میں پھنس جائے وہ اور پھنستا' پیچھے ہٹتا اور پستی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے۔

اصلاحِ قوم کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔ قدم قدم پر مایوسی کے اندھیرے چھاتے چلے جاتے ہیں' اور انسان بہ آسانی مایوسی کے کینسر کا شکار ہو جاتا ہے۔ دنیا کے دوسرے کام بالعموم ایسی چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جن کو انسان اپنے ارادے اور فن سے اپنے حسبِ ضرورت ڈھال سکتا ہے' وہ ان قوانین سے بھی واقف ہوتا ہے جن کے مطابق یہ کام ہوتا ہے' اور ایک معقول حد تک نتائج اور رفتارِ کار کا اندازہ بھی وہ کر سکتا ہے۔ لیکن فرد اور قوم کی اصلاح میں اس کا سارا واسطہ انسان اور اجتماعیت سے پڑتا ہے۔ وہ اپنے ارادے اور فن سے لوہے کو موم کر سکتا ہے 'پتھر کے دل کو کیسے نرم کرے؟ وہ پہاڑوں کا سینہ چیر کر سونا نکال سکتا ہے 'شخصیت کی کانوں میں سے سونا کیسے برآمد کرے؟ وہ جانتا ہے کہ گندم کی بالی اور سیب کے درخت کن عوامل کی مدد سے اور کتنی مدت میں سنہرے دانے اس کی گود میں ڈال دیں گے 'لیکن وہ نہیں جانتا کہ سچائی' عدل' رحم اور وفا کے بیج کس طرح اور کتنے وقت میں بار آور ہوں گے۔ وہ اینٹ پر اینٹ رکھ کر ایک مضبوط دیوار بنا سکتا ہے 'لیکن جہاں ہر اینٹ کی خُو الگ' وضع الگ' شناخت الگ 'بھٹی الگ ہو' وہاں وہ ایک پختہ اور قابلِ اعتماد دیوار کیسے بنائے؟ وہ حساب لگا سکتا ہے کہ رات کب ختم ہوگی اور صبح کب طلوع ہوگی 'لیکن اس کے پاس کوئی فارمولا نہیں جو یہ بتا دے کہ قوم کی شبِ تاریک کب سحر ہوگی؟ اور سحر ہو بھی گئی تو کیا یہ سحر وہی سحر ہوگی جس کو اس نے اپنے نالہ ہائے نیم شبی سے سینچا تھا' اور جس کی دید کی تمنا میں اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں؟

شیطان ہر طرف سے مایوسی کے لشکر ہزار بھیس میں چڑھا کر لاتا ہے۔ ابھی انسان اپنی اہلیت اور تقویٰ کے بارے میں مایوسی کے پھندے -- میرا تقویٰ اور صلاحیت اس لائق کہاں؟-- سے بڑی

مشکل سے نکل ہی پاتا ہے 'کہ دوسرے لوگوں کی خامیوں اور کوتاہیوں 'معیارِ مطلوب سے فروتری 'اور نقائص اور نااہلیتوں کا علم اور مشاہدہ اسے ڈھیر کر دیتا ہے۔ گویا کہ اللہ نے عدل و رحمت کے تقاضوں کو فراموش کر کے اس پر ایسا بوجھ لاد دیا ہے جو اس کے بس سے باہر ہے۔ یا' دوسروں کی بداعمالیوں کا بوجھ بھی اسے ہی اٹھانا ہے' اور دوسروں کے نقائص خود اس کی ذمہ داری کو ساقط کر سکتے ہیں۔ ان مایوسیوں پر وہ قابو پاتا ہی ہے کہ راہ کی مشکلات منہ پھاڑے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں: زمانہ بڑا خراب ہے-- مادہ پرستی اور خود غرضی کا غلبہ ہے-- کوئی بات سنتا ہی نہیں-- روٹی 'پیسہ اور مکان 'رنگ ' نسل اور زبان کے نعروں میں جو کشش ہے 'اس کا مقابلہ ممکن نہیں-- مسائل لاینحل ہیں۔ لیڈر سب مفاد پرست 'اقتدار کے بھوکے اور قوم کو بیچ کھانے والے ہیں-- ہر شخص چور ہے اور ہر شخص قانون شکن 'پٹواری اور میٹر ریڈر سے لے کر کمانڈر 'وزیراعظم اور صدر تک-- لوگ انھی کے پیچھے دوڑتے ہیں-- جہالت 'پیسے کا لالچ 'سیکڑوں سال کی جاگیردار کی غلامی 'اخلاقی پستی 'اب دعوت و اصلاح سے کیا بنے گا 'نہ لیڈروں کے کانوں پر جوں رینگتی ہے نہ عوام کے-- اب تو اس صورتِ حال کا علاج ڈنڈا ہے یا ایک خونی انقلاب۔

مایوسی کے ان سارے پھندوں کو توڑنے کے لیے علم و حکمت بھی درکار ہے 'بڑی ہمت اور حوصلہ بھی۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ ہماری قوم و وطن کی بظاہر انتہائی بگڑی ہوئی 'تشویش ناک اور مایوس کن حالت میں تغیّر و تبدیلی اور اس کے بظاہر لاینحل مسائل کا حل بالکل ممکن ہے۔ اس کی کنجی موجود ہے۔ لیکن یہ کنجی نہ ڈنڈے میں ہے 'نہ خونی انقلاب میں 'نہ محض خوش نما مواعظ میں 'نہ جھوٹی تمناؤں اور خوش فہمیوں میں 'اور نہ شیخ چلّی کے خوابوں میں۔ یہ کنجی ہم لوگوں کی مٹھی میں ہے۔ ہمارے شعور ' ارادے اور کوشش میں ہے۔ اگر لوگوں کے اپنے چاہے اور کچھ کیے بغیر' صرف جبر کے ذریعے 'لوگوں کی حالت میں تغیر برپا ہو جایا کرتا 'تو رحیم و حکیم خالق کے جس قانونِ امتحان اور جزا و سزا پر یہ دنیا تخلیق کی گئی ہے 'وہی باطل ثابت ہو جاتا۔ ہمارے ملک کے لیے بھی 'دوسری قوموں کی طرح 'ناقابل مفر ضعف مقدر ہے نہ مرگ۔ وہ پستی سے بلندی کی طرف اٹھ سکتی ہے 'ضعیفی سے شباب کی طرف پلٹ سکتی ہے 'قومِ یونس کی طرح موت و ہلاکت کے گڑھے سے نکل کر زندگی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ جو اصلاحِ خلق اور انقلابِ اجتماعی کا بیڑا اٹھائے 'اس کا دل کتنا ہی غم و اندوہ سے بھرا اور گھٹتا رہے 'اس کے سینے میں ہمیشہ امید کا سمندر موج زن رہنا چاہیے۔

امید کے معنی یہ نہیں کہ ہم حالات و حقائق سے ناواقف رہیں ' یا ان کو نظرانداز کر دیں ' شتر مرغ کی طرح ریت میں سرچھپالیں ' تلخ اور سنگین حقیقتوں سے نگاہیں چار نہ کریں ' طفل تسلیوں اور خوش فہمیوں کے سہارے زندہ رہیں ' رہزنوں سے امیدیں باندھ کر ان کو اپنا رہبر بنالیں ' تاریخ اور فطرت کے قوانین سے آنکھیں بند کر کے ہرلمحہ یہی مسکّن راگ الاپتے رہیں کہ بس تبدیلی تو آیا ہی چاہتی ہے۔ شیخ چلّی کی طرح خواب دیکھنے والے بالآخر اپنے ہاتھوں وہ متاعِ قلیل بھی ضائع کر دیتے ہیں ' جس کے بل بوتے پر تبدیلی اور تعمیر کا کام ہونے کی امیدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ یقیناً پاکستان کے لیے امید کا خزانہ ضروری ہے ' لیکن کچھ کر لے جانے کے لیے' اس تلخ حقیقت سے آغاز کیے بغیر چارا نہیں کہ ہمارا ہرشعبہ زندگی زوال اور بگاڑ کا شکار ہے ' اور اس کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر ہرشعبے کی قیادت پر ہے۔ کوئی مسئلہ لاینحل نہیں -- سیاسی عدم استحکام ہو ' بدامنی ہو ' کراچی کی خون ریزی ہو ' یا کچھ اور -- لیکن جن کے ہاتھوں میں مسائل کی گرہیں کھولنے کا اختیار ہے ' وہ حالات کو مزید بگاڑنے کے علاوہ اور کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اب یا تو وہ اپنی اصلاح کریں ' یا ان کو اٹھاکر پھینک دیا جائے ' اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ ہماری اس تشخیص کا کوئی تعلق امید یا مایوسی سے نہیں ' لیکن اگر یہ تشخیص صحیح ہے تو جو لائحۂ عمل کامیاب ہو گا وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ہو گا۔ اس لائحہ عمل کے حصول کے لیے تدابیر کی نوعیت ' ان کے درمیان تقدیم و تاخیر اور تدریج و ترتیب کا انحصار بھی کلیتاً اس تشخیص پر نہیں۔ ظاہر ہے کہ بہ یک وقت نہ سب کی اصلاح ہو سکتی ہے ' نہ سب کو اٹھاکر پھینکا جاسکتا ہے ' نہ سب کی اصلاح سے ہاتھ دھوئے جاسکتے ہیں۔

ہم اس بات کو انصاف کی بات نہیں سمجھتے کہ لعنت ' ملامت اور مذمت کا سارا بوجھ قیادت کے سر پر ڈال دیں ' اور تحسین و آفرین کے سارے ڈونگرے عوام کے سر پر برسا دیں۔ عوام بھی ذمہ دار ہیں۔ وہی سیاسی لیڈروں کے پیرِ تسمہ پا کو اپنی گردنوں پر بٹھاتے ہیں۔ اگرچہ صدیوں سے جس نفسیاتی ' سماجی ' معاشی اور سیاسی شکنجے میں وہ کسے ہوئے ہیں ' انھیں اس کی پیداکردہ بے بسی کا الاؤنس دینا ضروری ہے۔ ان کی دنیا پرستی اور اخلاقی زوال کا اعتراف بھی ضروری ہے ' اگرچہ اس میں فقر کی مجبوری کو زیادہ دخل ہے ' ہوسِ تکاثر کی تشویق کو بہت کم ' جو مترفین کے قلوب و اعمال کو چاٹ گیا ہے۔ افتراق و انتشار ' گو سالہ پرستی اور خون ریزی کے جرم سے وہ بَری نہیں ہو سکتے ' لیکن اصل مجرم تو سامریانِ وطن ہیں ' جنھوں نے اس راہ پر انھیں لگایا ہے۔ ان کی جہالت کو ہم موردِ الزام نہیں گردانتے ' کیونکہ عصرِ حاضر کی تعریف کے مطابق ''تعلیم یافتہ'' لیڈر ' جنرل ' افسر ' اخبار نویس ' تاجر ' عالم

اور استادِ جہالت کے کارناموں میں ان سے کوسوں آگے ہیں۔

عوام کی ہزار خرابیوں کے باوجود ' وہ اصلاح پذیر ہوں اور اصلاح کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو اصلاح کا راستہ کھل سکتا ہے۔ ہم ان میں خیر و صلاح کا بڑا خزانہ دیکھتے ہیں۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ ضرورت ان کے دلوں کے تالے کھولنے اور ان کے اندر روشنی کرنے کی ہے۔ ہمارے پاس کلید بھی ہے ' یدِ بیضا بھی ' لیکن ہم ان کے استعمال سے ناواقف یا غافل ہیں۔ ہم پُرامید ہیں کہ جیسے ہی ہم ان کے دلوں تک پہنچنے کے قابل ہوں گے ' ان میں حیاتِ طیبہ کی رَو دوڑنے لگے گی ' اور ربِّ غفور ان کے لیے بلدۃ طیبہ کے دروازے کھول دے گا۔ ان میں . . اقتل کر کے صحیح منزل کی طرف چلنے والے بھی ہوں گے ' ان میں ویسے ہی راہ چلتے حلقۂ ذکر میں بیٹھنے والے بھی ہوں گے۔

ہم ان سے اسی ہی طرح پُرامید ہیں جس طرح ہمارے نبی ؐ مکہ والوں کی زبردست عداوت و انکار اور جبر و استبداد کے مقابلے میں فرماتے تھے: ''میرے ربّ ' میری قوم کو ہدایت دے ' یہ جانتے نہیں !'' یا جس طرح آپ ؐ نے اہلِ طائف کے بارے میں فرمایا تھا۔۔ جبکہ آپ ؐ زندگی کا سب سے زیادہ سخت اذیت ناک دن گزار کر اس حال میں طائف سے واپس آ رہے تھے کہ پتھر مار مار کر گرائے گئے تھے ' گھٹنے چور ہو گئے تھے ' پنڈلیاں گھاؤ ہو گئی تھیں ' کپڑے لال ہو گئے تھے ' اور پہاڑوں کا فرشتہ ' جبریل امین کو ساتھ لیے کھڑا ' طائف کی وادی کو پہاڑوں کے درمیان پیس دینے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔۔ فرمایا تھا: ''میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو اللہ ہی کی بندگی کریں ' اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں''۔ اللہ اللہ ' امید کا ایسا اتھاہ سمندر جو آنے والی نسلوں تک پر محیط ہے ! بڑا سبق ہے اس میں ان لوگوں کے لیے جو آج کے رَدّ کرنے والوں کو آج ہی جہنم واصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں ' اور جن کی زبانیں ان کی مذمتیں کرنے سے نہیں تھکتیں۔ سینۂ مصطفوی ؐ میں امید کی اس آواز نے آگ کو باغ کر دیا ' اور ثقیف کی موت کے پروانے کو زندگی کی بخشش بنا دیا۔ ہر رسول اور نبی کا ایسا ہی عالَم تھا: میری قوم ' میری قوم ' کہتے ان کی زبان نہ سوکھتی ' اور جب قوم کی ہلاکت کا وقت آ ہی جاتا ' تو یہ کہتے ہوئے رخصت ہوتے: ''میں تو تمھاری خیرخواہی ہی کرتا رہا ' لیکن تم کو اپنے خیرخواہ پسند نہیں۔۔ جو انکار پر تُل ہی گئے ' میں ان پر کیسے افسوس کروں''۔

اپنی قوم کی اصلاح کا دعویٰ کرنا ' اسی کے ذریعہ اصلاحِ اجتماعی بروئے کار لانے کی حکمتِ عملی کا قائل ہونا ' اسی سے جھٹ مایوس ہو جانا ' اور اس کو لعنت ملامت اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دینا ' یہ رَوش مایوسی کے ساتھ کِبر اور عجلت پسندی جیسے امراض کا پتا بھی دیتی ہے۔ ہم قوم کے امراض کی حقیقت پسندانہ تشخیص کی ضرورت کے باوجود ' اس رَوِش کو مُہلک اور اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔

قیادت کے بحران کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ پاکستان بڑا بدقسمت ملک لگتا ہے کہ کسی شعبہ زندگی میں اسے اہل ' امانت دار اور محبِ وطن قیادت میسر نہیں آئی۔ اس تلخ داستان کو دہرانا ایک تکلیف دہ کام بھی ہے ' اور غیر ضروری بھی۔ تعلیمی ادارے روز بروز گرتے ہوئے معیار کے حامل انسان بنا بنا کر بھیج رہے ہیں۔ گیہوں اور کپاس جیسی فصلوں کی پیداوار خطرناک حد تک کم ہو چکی ہے ' آب پاشی کا نظام تباہ حال ہے۔ ڈاکٹر گھر بیٹھے تنخواہیں لیتے ہیں اور ہیلتھ سنٹروں میں خاک اڑتی رہتی ہے۔ صنعتی ترقی کا ڈھنڈورا خوب پیٹا گیا ہے ' بلکہ ترقیاتی وسائل کا بڑا حصہ اسی کی نذر ہو رہا ہے ' لیکن صنعتی پیداوار برابر گر رہی ہے۔ سڑکیں اور ریلیں اپنے حکمرانوں کے مجرمانہ تغافل پر نوحہ خواں ہیں۔ ملک کی سلامتی اب اتنی مخدوش ہوگئی کہ حکومت قیمتی ساحلی زمین (کتنی؟ ' یہ نہیں معلوم ' کس قیمت پر؟ نہیں معلوم ' کن شرائط پر؟ نہیں معلوم) بیرونی طاقتوں کے حوالے کر رہی ہے ' اور انتہائی بے شرمی سے اس کا جواز یہ پیش کرتی ہے کہ "پاکستان میں زمین خریدنا غیر قانونی نہیں" ' گویا کل امریکا سارا پاکستان بولی لگا کر خرید لے تو یہ عین قانونی فعل ہو گا اور حکومت کے لیے بالکل ناقابلِ اعتراض ' بلکہ عین پسندیدہ۔

اس کے باوجود کہ سیاسی انتشار و عدم استحکام ہو ' معاشی اور تعلیمی زبوں حالی ' یا پاکستان کے اِسترے بیچک مفادات کی خرید و فروخت -- اس کے لیے اصل ذمہ داری قیادت کی ہے ' ہم اس سے بالکل مایوس نہیں کہ "قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند" اور "میں نہ مانوں" کی اس رَوِش پر گامزن لیڈروں کے بھی دل بدل جائیں اور وہ صحیح راستہ دیکھنے اور چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر نبی کریم ؐ یہ امید رکھ سکتے تھے کہ ابوجہل یا عمرؓ جیسے اسلام کے کٹر دشمن حلقہ بگوشِ اسلام ہو سکتے ہیں ' فاتح احد خالد بن ولیدؓ ' ابوسفیانؓ ' عمرو بن العاصؓ اور معاویہ بن سفیانؓ جیسے عرب کے سیاسی دماغ کاروانِ اسلام کو لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں ' اگر ایک مردِ درویش کے ہاتھوں ' ہلاکو خان کا وارثِ تخت و سلطنت مسلمان ہو سکتا ہے اور عثمانیوں کا ۵ سو سالہ دورِ عروج ظہور پذیر ہو سکتا ہے ' تو آج ہمیں اس بات سے مایوس کرنے والی کیا بات ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا کوئی سیاسی لیڈر سچے دل سے اسلام کا علمبردار بن جائے ' یا مغرب کا کوئی لیڈر اسلام کی صف میں شامل ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض انسانوں کے دل پتھر اور لوہے سے زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ موت اور بے حسی کے شکنجوں میں وہ اس طرح کس جاتے ہیں کہ ایک مسیحا نفس کی صدائے قُم باذنِ اللہ سے مُردے

اٹھ کر چل پڑتے ہیں ' لیکن وہ صور کی آواز سے بھی ٹس سے مَس نہیں ہوتے۔ لیکن انھی دلوں کے قفل کھل جائیں تو ان کی اثر پذیری کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ چند پاک کلمات سے پتھر کے دل پگھل کر آنکھوں کی راہ بہہ نکلتے ہیں۔ (تَرٰی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ اور یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ)۔ مردہ دل کپکپانے اور دھڑکنے لگتے ہیں (وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ) ' سینے کھل جاتے ہیں اور نور سے بھر جاتے ہیں (اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ) موت کے مارے ہوئے معنوی اور اخلاقی وجود زندہ ہو کر چلنا شروع کر دیتے ہیں (اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ)۔

ہاں ' یہ سب ہونا آج بھی ممکن ہے۔ نہ انسان بدل گئے ہیں ' نہ کتابِ الٰہی۔ اس سوال نے مصلحین کو ہمیشہ اطمینانِ قلب کا متلاشی بنایا ہے: ''میرا رب ' مُردوں کو زندگی کیسے بخشے گا؟'' --- ''پستی پر مُردنی طاری ہونے کے بعد اللہ کیسے زندہ کرے گا؟''۔ انسانوں کے دل اللہ کے نزدیک اس طرح ہیں گویا اس کی انگلیوں کے درمیان ' اور وہ ان کو الٹا پلٹتا رہتا ہے۔ پاکستان کے حالات سے کتنی ہی مایوسی ہو ' بگاڑ کتنا ہی بڑھ گیا ہو ' لیڈر کتنے ہی نااہل ' بدعنوان اور قوم فروش ہوں ' عالمی طاقتیں کتنی ہی قوت سے ہمارا گلا گھونٹنے میں مصروف ہوں ' امید اور جذبِ دروں کے ساتھ آج بھی صرف یہی صدا دلوں میں تبدیلی اور حیاتِ اجتماعی میں تبدیلی کے لیے بانگِ جرس ثابت ہو سکتی ہے:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ (الحدید: ۵۷-۱۶)

کیا ابھی وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لیے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں ' اور اس حق کے آگے جھک جائیں جو اس نے اتارا ہے ' اور ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں جن پر ایک لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔

اس صدا کی کامیابی کے لیے امید کا سرچشمہ اللہ کے علاوہ کچھ نہیں ' اور وہی سب کچھ ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا (الحدید: ۵۷-۱۷)

خوب جان لو! اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔

اپنے اندر اور باہر سے امنڈنے والے مایوسی کے تاریک لشکروں کا مقابلہ روشنیوں کا وہ شہر ہی کر سکتا ہے جو منارۂ اسوۂ مصطفوی ؐ کے دَم سے آباد ہے۔ غارِ حرا سے یکہ و تنہا واپسی کے بعد یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے ہجوم تک آپ ؐ کا ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ اس امید اور صدا سے معمور ہے۔ اس منارے کے نور کا منبع وہ ذات ہے جو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ روشنی آتے ہی اندھیرا بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ چراغِ مصطفوی ؐ کی روشنی میں ہم اپنا سفر طے کریں تو مایوسی کے پاؤں

نہیں تک سکتے۔

رمضان کے مبارک مہینے کا سایہ آپ کے سروں پر ہے۔ یہ مہینہ امیدوں کی روشنیوں کا مہینہ ہے ' یہ مہینہ محنتوں کا مہینہ ہے ' یہ مہینہ بے حد و حساب اجر اور نتائج کا مہینہ ہے۔ اس مہینے نے وہ صبح دیکھی جب حضور ؐ لرزتے اور کپکپاتے غارِ حرا سے قرآنِ فرقان کی نعمت لے کر واپس گھر آئے ' اور آپ ؐ کی زبان پر "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" کے الفاظ تھے۔ پھر اس مہینے نے وہ دن دیکھا جب بدر کے میدان میں زندگی نے موت پر فتح پائی ' صرف اہلِ عرب کے لیے نہیں ' رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے یہ دن یوم الفرقان قرار پایا۔ پھر اسی مہینے نے وہ دن بھی دیکھا جب غارِ حرا سے اترنے والا اور مکّہ سے نکالا جانے والا ' صلی اللہ علیہ وسلم ' مکّہ میں اس شان سے داخل ہوا کہ اس کا سر اونٹنی پر اپنے رَبّ کے آگے جھکا ہوا تھا ' اس کے اِرد گرد ہزاروں قدسیوں کے لشکر تھے ' اور ایک قطرۂ خون بہائے بغیر مرکز ارضی ' بیتِ رَبّانی ' خانہ کعبہ کے دروازے کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہی دروازہ جو اس کے لیے کھولنے سے انکار کر دیا گیا تھا ' اور اس نے کامل یقین اور امید سے بھرپور لہجے میں کہا تھا کہ ایک دن یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ دن یوم الفتح کا دن تھا۔

خانہ کعبہ کی کنجی کچھ اچانک یونہی آپ ؐ کے ہاتھوں میں نہیں آگئی تھی۔ نہ حرا ' کوہ صفا اور طائف سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا تک کا انقلاب کوئی حادثہ تھا۔ نہ نزولِ قرآن کی سحر سے لے کر یومِ فتح کی صبح تک کا سفر صرف خواہشات ' تمناؤں اور دعاؤں کے بل پر طے ہوا تھا۔ کعبہ کی کنجی ہاتھ میں آنے سے پہلے لوگوں کے دلوں کی کنجیاں آپ ؐ کی مٹھی میں تھیں ' اسی لیے آپ ؐ کو کعبہ کی کنجی عطا ہوئی۔ اس سے پہلے کہ مکہ اپنے دروازے کھولے ' بستی بستی ' خیمہ خیمہ ' دل دل آپ ؐ کے لیے پھاٹک کھل چکے تھے ' اور اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آپؐ مکہ میں داخل ہو جائیں۔

یہ نبی کریم ؐ کی رات دن کی جدوجہد تھی۔ یہ آپؐ کی ہر دَم ' ہر لمحہ ' انتھک ' دعوت اِلی اللہ کی کاوش تھی۔ یہ آپ ؐ کی پیار اور رحمت کی رَوِش ' دل کی نرمی ' اخلاقِ کریمانہ ' خلقِ عظیم اور قربِ الٰہی کی تاثیر تھی کہ یہ معجزہ رونما ہوا۔ اس پورے عرصے میں آپؐ کو حقائق کی سنگینی اور تلخی کا پورا ادراک تھا ' آپ ؐ نے ہر تدبیر کی ' لیکن کسی لمحے بھی جھنجلاہٹ ' غصہ ' مایوسی اور انتقام کا شائبہ بھی آپؐ کے دل میں اور آپؐ کی رَوِش میں پیدا نہ ہوا۔ دشمن ایک ایک کر کے آتے گئے ' قدموں پر ڈھیر ہوتے گئے ' اور آپؐ ان کو جھاڑ پونچھ کر سینے سے چمٹاتے رہے۔ یہی ورثۂ نبوی ؐ ہے ' جس کے ضیاع یا جس سے غفلت کی وجہ سے ہم آج درماندہ اور حیران و پریشان ہیں۔ روشنیوں کا جو مہینہ آج ہمارے اوپر

سایہ کیے ہوئے ہے 'اس کا حاصل بھوک پیاس نہیں ' دنجگا نہیں ' افطار و سحر کی مدارات نہیں۔ اس کا حاصل یہی ورثۂ نبویؐ ہے۔ اس مہینے میں حضورؐ بارش بھری ہواؤں سے بھی زیادہ فیاضی اور سخاوت کی بارش برسایا کرتے تھے۔ روحانی و اخلاقی فیوض کی بارش بھی ' مادی و مالی فیوض کی بھی۔ اس لیے کہ یوم حرا سے یوم بدر تک اور یوم بدر سے یوم فتح تک کا سفر طے کرنے کے لیے جو زندگی اور روئیدگی ناگزیر ہے وہ اسی بارش کے فیض سے حاصل ہو سکتی ہے۔

نیت کی پاکیزگی ' اخلاص اور بے غرضی ' قرآن کا قرب ' قیام لیل ' تقویٰ ' صبر ' محبت و موانست ' نفس و زبان پر لگام ' غصے اور جھگڑے سے اجتناب--- اس سفر کے لیے جو زادِ راہ درکار ہے ' اس کے سارے نشانات اور حصول کے راستے اس ماہ مبارک میں موجود ہیں۔ فرمایا گیا: پیٹ کو کھانے پینے سے فاقہ کرانا ' روزہ نہیں۔ روزہ تو یہ ہے کہ زبان کو بیہودہ و بیکار اور شہوانی بات چیت سے فاقہ کراؤ۔ اگر کوئی تمھیں گالی دے یا جھگڑے پر اتر آئے ' تو کہہ دو میں روزے سے ہوں! میں روزہ سے ہوں! (ایسی باتوں میں نہیں پڑ سکتا)۔ آج کے مُصلحین ' رمضان سے یہی ایک خصلت حاصل کر لیں ' تو خیر کثیر حاصل کر لیں گے۔ فرمایا گیا: جن کے لیے مغفرت عام نہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو دوسروں سے بغض و عداوت اور نفرت رکھنے والا ہے۔ دلوں میں جھانک کر دیکھیے ' ہم ان گندگیوں سے کتنے پاک ہیں۔

کیا رمضان کے یہ لمحات ' بارہ نصیب ہوں گے؟ کون کہہ سکتا ہے ' ہاں۔ پھر ان کو غنیمت جانیں ان کو ضائع نہ جانے دیں ' ان سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ مایوسیوں کا دامن جھٹک دیں ' جھوٹی امیدیں بھی نہ باندھیں ' مرثیے پڑھنا بھی چھوڑ دیں۔ یقین رکھیں کہ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اگر روشنی کی کرن نمودار ہوگی ' اور پیاسی ' چٹختی دھرتی میں روئیدگی نمودار ہوگی ' تو کچھ کرنے سے ہوگی ' عمل سے زندگی بنتی ہے ' جنت بھی جہنم بھی ' اور ہمارے کرنے سے ہوگی۔ ہم بارش کا پہلا قطرہ بنیں گے تو اللہ تعالیٰ کو ہمارے پاکستان اور ہماری قوم کا مقدر بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ وہ مالک الملک ہے ' مُردے میں سے زندہ کو نکالتا ہے ' دیتا ہے تو بلا حساب دیتا ہے۔

اپنی اصلاح کی بھی فکر کریں ' خیر اور تقویٰ عام کرنے اور اس کی بہار لانے کی بھی۔ بدکاروں کے خلاف نفرت و عداوت کے بجائے ان کے لیے نصیحت و خیر خواہی ' ان سے امید ' اور ان کی نصرت (ان کا ہاتھ پکڑنے) کی رَوِش اختیار کریں۔ سب کو یہی صدا دیں ' سب کو جگائیں ' سب کے دلوں کی آبیاری کریں۔

وہی دیرینہ بیماری ' وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی